جناب جارج کیری
آرچ بشپ آف کنٹربری

مسلم - مسیحی مکالمہ کو درپیش چیلنج

[اکتوبر ۱۹۹۵ء میں اینگلیکن چرچ کے مرکزی رہنما آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر جارج کیری نے جامعہ ازہر قاہرہ کے اساتذہ و طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے مسلم - مسیحی مکالمہ کی اہمیت اور اس کو درپیش چیلنج پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ خطاب کا انگریزی متن انہی دنوں شائع ہو گیا تھا، مگر اس کا اردو ترجمہ ایک دو ماہ پہلے برطانوی ہائی کمیشن - اسلام آباد کی جانب سے چھپا ہے جو ناشرین کے شکریے کے ساتھ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ مدیر]

جامعہ الازہر میں ایک مسیحی رہنما کو اہم لیکچر دینے کا موقع میسّر آنا اس کے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میں یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر احمد عمر ہاشم کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اس اہم خطاب کا موقع دیا۔ جامعہ الازہر دنیا بھر میں نہ صرف الازہر مسجد جو مسلم دنیا میں اسلامی تعلیمات کا ایک اہم مرکز ہے، سے منسلک ہونے کی وجہ سے شہرت رکھتی ہے، بلکہ اسے غالباً دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

میں اس موقع پر یونیورسٹی کے حکام کو مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں جن کی کوشش سے جامعہ الازہر اور انگلینڈ کے برمنگھم میں سیلی اوک (Selly oak) کالجز کے "مرکز برائے سٹڈی آف اسلام" میں کرسچین - مسلم تعلقات کے درمیان تعاون کی فضا ہموار ہوئی اور "ایسوسی ایشن برائے انٹرنیشنل مسلم - کرسچین ڈائیلاگ" اور بین المذہبی کانفرنسوں کا انعقاد ممکن ہو سکا۔

مسیحیوں اور مسلمانوں پر انسانیت کے حوالے سے بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے ماننے والے دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ ہیں اور دونوں عقائد کے پیروکاروں نے کبھی اپنی گرفت اور قوت کو کمزور نہیں ہونے دیا، تاہم اگر تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ دونوں نے عالمی امور میں کسی حد تک مبہم کردار ادا کیا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی بہت متعصب ہی ان کے مثبت کردار کو جھٹلا سکے گا۔ انسانی معاشروں میں تعلیم، سماجی تحفظ اور اخلاقی اقدار جو انسانیت کی بھلائی کے لیے ضروری ہیں، کے فروغ کے لیے اسلام اور عیسائیت نے بلا خوف تردید بڑا

اہم کردار ادا کیا۔ بہت سے لوگ اپنی مذہبی وابستگی سے بالاتر ہو کر اس بات پر شکر گزار ہیں کہ جو راستہ ان کو دکھایا گیا اور جس طرح معاشرے تشکیل دیے گئے، وہ ان ہی مذاہب کے عقائد کی روشنی کا مرہون منت ہے اور اسی طرح ان مذاہب نے لاکھوں کروڑوں انسانوں کی گود سے گور تک صحیح پرورش کی۔ میرے اپنے ملک میں حتیٰ کہ وہ لوگ جو چرچ میں بھی نہیں جاتے، ان میں سے اکثریت اس بات سے بخوبی آگاہ ہے کہ اقدار، روایات اور کسی عقیدے کے اخلاقی معیارات سے دور ہونے سے معاشرے کو بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے اور یہ بات مسلّمہ ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں، اس میں مذہب کا بہت بڑا کردار ہے، کیونکہ مذہب ہی ہمیں وہ حوصلہ اور طاقت عطا کرتا ہے جس کے ذریعے زندگی اور موت، مقصدیت اور معنویت کے سوالات کا سامنا کرنے کی جرأت ہم میں پیدا ہوتی ہے۔

جبکہ دوسری طرف اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے۔ یہی مذہب جو معاشرے کی تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، قابل افسوس بات یہ ہے کہ بعض اوقات یہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا اور تقسیم کرنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ میں اس وقت صرف بوسنیا کی حالیہ صورت حال کا حوالہ دوں گا، لیکن میں اس بات سے بھی بہت زیادہ واقف ہوں کہ اسلام اور عیسائیت کے مابین قرونِ وسطیٰ کے تنازعوں اور جھگڑوں نے تاریخ پر بہت دور رس اثرات مرتّب کیے۔ جدید دنیا سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی مسیحی ہمارے آباء و اجداد کے ماضی کے ان فیصلوں اور اپنائے ہوئے راستوں سے خوش نہیں ہوگا۔ صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کے اپنے درمیان اور عیسائیوں کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کو بری طرح نقصان پہنچایا۔ اس پر جتنی بھی معذرت کی جائے کم ہے۔ اگرچہ آج بھی مذہبی لڑائی جھگڑے جاری ہیں، لیکن افسوس کی بات ہے کہ تشدّد کو عموماً جذبات سے منسلک کر دیا جاتا ہے جو بعد ازاں مختلف عقائد سے تعلق رکھنے والے لوگوں اور معاشروں کی شناخت بن جاتا ہے۔ غربت اور مایوسی کی صرف دو مثالوں کو لے لیجیے۔ ان کو عقیدہ کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یا تو کسی کے خلاف جارحیّت یا پھر کسی دوسرے کو قصوروار ٹھہرانے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

لیکن ہمیں اس پر مزید غور کرنا چاہیے۔ مذہب کے مذکورہ تاریک پہلو سے عموماً ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی صورتِ حال دنیا میں صرف وہاں وہاں وقوع پذیر ہے جہاں امن و آشتی کے پختہ عقیدہ کی جگہ عدم برداشت اور جہالت نے لے لی ہے، تاہم بعض اوقات وہ معاشرے جن کے درمیان عقائد کی بناء پر دیرینہ کشیدگی پائی جاتی ہے، ان کی باگ ڈور گمراہ کرنے والے افراد کے ہاتھوں میں آجاتی ہے جس سے پرامن مکالمہ اور مہذب رویے کی جگہ تشدّد اور قتل و غارت لے لیتی ہے۔

میں یہاں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے سابق یوگوسلاویہ کے تنازعہ کی ضرور وضاحت کرنی چاہیے۔ بوسنیا ہرزیگووینا میں نسلی تشدد کی خوفناک صورتِ حال سے پوری دنیا واقف ہے۔ وہاں پر نسل کشی،

خواتین اور بچوں کے خلاف پر تشدد جرائم وہ ناقابل معافی جرائم ہیں جن کا کوئی جواز نہیں اور اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مساجد اور عبادت گاہوں کی مسماریت سے مسلمانوں میں یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ ان سب کارروائیوں کا مقصد صدیوں سے یورپ میں موجود مذہب اسلام کو ختم کرنا ہے۔ ایک انگریز تاریخ دان کے مطابق "گزشتہ دو سالوں کے دوران مغربی میڈیا کے ذریعے پیش کی جانے والی غلط اور گمراہ کن خبریں سابق یوگوسلاویہ میں اختیار کیے جانے والے قدرتی اور سیاسی طریقہ کار سے خود بخود دم توڑ گئیں۔" اور میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ اس طرح کی صورت حال اسلامی دنیا میں بھی پائی جاتی ہے۔ بوسنیا میں گزشتہ ہفتوں کے دوران تازہ ترین کوششوں سے امید کی کرن پیدا ہوئی ہے، لیکن مذہبی رہنماؤں کو دائمی امن کے قیام میں ذمہ دارانہ اور بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے کیونکہ اس دنیا میں مذہب کی طاقت کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کے انحطاط کا کوئی امکان نہیں اس لیے یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ دنیا کے عقائد کے درمیان امن کا فروغ اس وقت انسانیت کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جرمنی کے مشہور دینی عالم پروفیسر ہینس کنگ (Hans Kung) جو اس موضوع پر دنیا کے چند اہم ترین فلاسفروں میں سے ایک ہیں، نے لیمبتھ پیلس (Lambeth Palace) میں گزشتہ سال اپنے خطاب کے دوران اعلان کیا تھا کہ "مذاہب کے درمیان امن نہ ہو تو تہذیبوں کے درمیان تصادم ہو گا اور مذاہب کے درمیان مکالمہ کے بغیر مذاہب کے درمیان امن قائم نہیں ہو سکتا اور کسی مذہب کی بنیادوں کی تحقیق کے بغیر مذاہب کے درمیان مذاکرات نہیں ہو سکتے۔" یہ تجزیہ بالکل درست ہے۔

دنیا کے بہت سے حصوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے بہت عرصہ تک ثقافت اور مذہب کی قوت کو کم اہم سمجھا جاتا رہا ہے اور ہم بالخصوص نوجوانوں کے لیے اس کی اہمیت کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں اور جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ "نسل پرستی سے زیادہ مذہب لوگوں کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص آدھا فرانسیسی اور آدھا عرب ہو سکتا ہے اور اسی طرح ایک وقت میں وہ دو ممالک کا شہری ہو سکتا ہے، لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص نصف کیتھولک اور نصف مسلمان ہو۔"

یہ حالات کس بات کے متقاضی ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ہمیں کس طرح کے نئے تعلقات استوار کرنے چاہییں؟ مجھے ان سوالات کے جواب روئیے کو تبدیل کرنے والے چار عناصر کی مدد سے دینے کی اجازت دیجیے۔

۱۔ عداوت نہیں دوستی
۲۔ لاتعلقی نہیں مفاہمت
۳۔ امتیازیت نہیں برابری کے باہمی تعلقات
۴۔ محاذ آرائی نہیں تعاون

اب میں ان چار کی مختصراً وضاحت کروں گا۔

ا۔ عداوت نہیں بلکہ دوستی

میں نے یہاں پر "برداشت" کی بجائے "دوستی" کے لفظ کے استعمال کو ترجیح دی، کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اول الذکر کے ساتھ ہم نے بہت سے معنی وابستہ کر رکھے ہیں۔ میں لفظ "برداشت" کے تمام مثبت پہلوؤں سے اتفاق کرتا ہوں، تاہم اس کا استعمال اس لیے نہیں کرتا، کیونکہ اس لفظ کی ایک سیکولر تعریف یہ بھی ہے جس کا مفہوم برداشت کی بجائے بے پروائی یا لاتعلقی بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ برداشت کے حقیقی معنی یہ ہرگز نہیں ہیں، بلکہ میرے خیال میں "برداشت" اپنے عقائد سے گہرے تعلق کو قائم رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کے لوگوں کے عقائد کا احترام اور ان کو اپنے عقائد پر پرامن زندہ رہنے کی اجازت دینا ہے۔ درحقیقت میں جس "جذبۂ دوستی" کی بات کر رہا ہوں وہی تمام انسانی رشتوں کی بنیاد بنتا ہے اور یہ جذبہ اپنے اندر حقیقی برداشت کو بھی سموتا ہے۔ دوستی دراصل وہ تناظر ہے جس میں آپ کسی کے عقائد کے ساتھ فرق تو رکھ سکتے ہیں، مگر اس کے خلاف نفرت یا دشمنی کی بجائے اس سے محبت کرتے ہیں۔ ایک عظیم عرب دانشور البرٹ ہورانی نے صحیح کہا ہے کہ "کوئی شخص اسلام کی صحیح معنوں میں ترجمانی نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ وہ اس کے ساتھ ایک زندہ رشتہ کو محسوس نہ کر سکے۔" عیسائیت کے بارے میں بھی یہی بات یا اصول صادق آتا ہے۔ ہورانی جس "زندہ رشتہ" کی بات کرتے ہیں، اسے ہی مذاہب کے درمیان "ڈائیلاگ" میں مرکزیت حاصل ہے۔ دراصل یہ حقیقت کہ ہم دنیا کے مختلف حصوں میں رہتے ہوئے بھی ایک ہی جغرافیائی حدود میں مقید ہیں، اس "زندہ رشتے" کا ایک اظہار ہے۔ ۳۰ سال قبل ہم برطانیہ میں رہنے والے دنیائے اسلام کے وجود سے ہی شاید بمشکل صحیح واقف تھے اور اب وہ وقت ہے کہ نہ صرف اسلام کے وجود سے واقفیت عام ہے اور اس کے مختلف تہذیبی مظاہر کا فہم بھی عام ہو گیا ہے، بلکہ یہاں تک کہ ہماری دنیا میں بھی اسلام کے لیے ہمدردانہ اور دوستانہ جذبات فروغ پا رہے ہیں۔ مثلاً بریڈفورڈ کو ہی لے لیں۔ وہاں یہ احساس شدت کے ساتھ پایا جا رہا ہے کہ مسلمان برطانیہ کے لیے اہم مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دوستی کی ایسی ہی فضا میں "حقیقی برداشت" کی صحیح طور پر اور ہم آہنگی کے ساتھ بات کی جا سکتی ہے۔ یہ برداشت کا جذبہ ہی ہے جو ہمیں دوسروں کی بات کو سننے، سمجھنے اور مختلف عقائد رکھنے والے کو سراہنے کے لیے تیار کرتا ہے اور ہمیں اس بات کی پہچان کراتا ہے کہ دوسرے عقائد کے لوگ بھی ایک انسان کے طور پر اسی طرح عزت کے مستحق ہیں جس طرح ہم خود ہیں۔

اکثر اوقات ایسی دوستی باہمی شخصی رابطے، تبادلۂ خیال اور مہمان نوازی سے آگے بڑھتی ہے۔ میرا یقین ہے کہ مذہبی رہنماؤں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھائی چارے کی مثالیں قائم کریں

اور ایک دوسرے کی بات سے استفادہ کریں۔ مجھے اپنے مشرقی لندن کا چند سال قبل کا ایک سفر نہیں بھولتا، جب میں نے برک لین کی مسجد میں مسجد کے امام اور ان کے رفقاء کے ساتھ چائے پی تھی۔ مجھے یہ سن کر بہت مسرت ہوئی تھی کہ ان لوگوں کے ویکار (Vicar) اور (Spitafields) کے کرائسٹ چرچ کے ساتھ گزشتہ ۵۰ سال سے بڑے قریبی تعلقات تھے۔ اس دن مجھے اتنی انسانی خوشی ہوئی اور مسلمانوں کی طرف سے مجھے وہ والہانہ جذبات ملے کہ میں نے ان کی طرف سے ملنے والی دعوت فوراً قبول کرلی۔ انہوں نے ایک اچھے کام کی ابتداء کی اور میں نے اس کا مثبت جواب دیا۔ اس طرح دوستی کو فروغ حاصل ہوا۔ درحقیقت ایسے ہی واقعات سے حقیقی برداشت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور عداوت کے وہ خدشات جن کی بنیاد خوف پر ہے دم توڑ جاتے ہیں۔

۲۔ لاتعلقی نہیں مفاہمت

یہ بات بڑی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے لاتعلق ہیں۔ یہی لاتعلقی ثقافتی بیماریوں میں سب سے خطرناک مرض ہے اور اس سے خوف، غلط فہمی اور عدم برداشت کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں یونیورسٹی آف ایگزیٹر (Exeter) کے اسلامی تعلیمات کے پروفیسر ڈاکٹر عزیز العازمی کی ایک کتاب "اسلام اور ماڈرنٹیز" (Islam and Modernities) شائع ہوئی جس میں مصنف نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ کس طرح مختلف ادوار میں مغرب نے اسلام کو سمجھا۔ مصنف نے ان تین تعریفوں کا ذکر کیا ہے جس سے اسلام کا واسطہ پڑا۔ (الف) سولھویں صدی کی اصلاحات سے قبل اسے عدم برداشت کا حامل مذہب خیال کر کے اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ (ب) اٹھارہویں صدی کے Enlightenment کے دور میں اس کو عجیب و غریب بلکہ مضحکہ خیز قرار دیا گیا اور (ج) جدید دور میں اسے ایک ایسا عقیدہ سمجھا جارہا ہے جس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عیسائیت سے متعلق اسلام کی تاریخ میں بھی ایسے ہی خیالات دیکھنے کو ملیں گے۔ ہم اپنے گرد پائی جانے والی اس لاتعلقی اور جہالت پر کس طرح قابو پاسکتے ہیں؟ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں مذہبی سیمیناروں اور درسگاہوں سے اس کام کا آغاز کرنا چاہیے جہاں سے لوگوں کو اس بات کے لیے تیار کیا جاتا ہے کہ وہ دوسروں کو علم کی آگاہی دیں۔ میں نے گزشتہ سال بھارت میں ایک موقع پر اپنے خطاب میں کہا تھا کہ مجھے اس دن کا انتظار ہے جب وہ تمام لوگ جو اپنے عقائد کی تعلیمات حاصل کررہے ہیں، اس بات کی بھی ضرورت محسوس کریں گے کہ وہ دیگر دو عقائد کی طرز حیات اور تعلیمات سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ برمنگھم میں سیلی اوک کالج میں بہت عرصہ سے اسلامک سٹڈیز کا شعبہ قائم ہے۔ دو ہفتے قبل میں نے آکسفورڈ کے سنٹر برائے اسلامک سٹڈیز کا دورہ

کیا اور میں وہاں اس سلسلہ میں شروع کیے گئے کام سے خاصا متاثر ہوا۔ یہ ادارہ کرسچین معاشروں اور کالجوں کے مابین تعلقات کے فروغ کے لیے بھی قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ کام ہوسکتا ہے اور اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انتہا پسندی کو بھی جڑ سے اکھاڑنا چاہیے جو تشدد کا باعث بنتی ہے اور ہم اگر ایک دوسرے کا احترام کریں اور اس بات کو اجاگر کریں کہ خواہ ہم اسلام یا عیسائیت کو پسند کرتے ہوں یا نہ، لیکن ایک دوسرے کے عقائد کا احترام کریں گے تو دونوں ایک دوسرے سے دور نہیں ہوں گے۔ اس سلسلہ میں مذہبی رہنماؤں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ایسے معاشروں، جہاں ثقافت کی بنیاد عقائد پر ہے، میں لاتعلقی کی بجائے مفاہمت کو یقینی بنائیں۔

۳۔ امتیازیت نہیں برابری کے باہمی تعلقات

اگر ڈائیلاگ کی بنیاد دوستی پر ہو تو برابری کے باہمی تعلقات سے انحراف کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر ہم اس چھوٹی سی پرہجوم دنیا میں امن اور ہم آہنگی کے قیام میں سنجیدہ ہیں تو پھر ہمیں دوسروں کے عقائد کے ساتھ دوستی اور باہمی احترام کا رشتہ قائم کرنا ہوگا۔ باہمی برابری کے تعلقات کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس کی راہ میں حائل ہونے والے سنگین مسائل کا سامنا کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں مشنری عقائد پر مشتمل ہیں۔ ہم اپنے عقائد کے بارے میں مطلق دعوے کرتے ہیں اور اپنے عقائد کے فروغ اور تبلیغ کے لیے بڑے بے چین ہوتے ہیں۔ ایسی صورت حال دونوں مذاہب کو درپیش ہے اور اس سلسلہ میں کسی کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ مسلمانوں کو قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے "انسانیت کے لیے گواہ بن جاؤ" اور اسی طرح آسمانی صحیفہ میں مسیحیوں کو کہا گیا ہے "دنیا میں جاؤ اور انجیل کی تبلیغ کرو۔"

وقتاً فوقتاً یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ایسے پیروکار جو دل سے اس بات پر یقین رکھتے ہوں کہ ان کا اپنا عقیدہ مشنری ہے اور لوگوں کو پاکیزگی اور سچائی کی طرف بلاتا ہے، کیا وہ ڈائیلاگ کے لیے تیار ہوسکتے ہیں؟ میرا جواب یہ ہے کہ یقیناً ہم ایسا کرسکتے ہیں اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ہم ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہونے کے لیے رضامند ہوں اور ہم نے امن کے قیام کا عزم کر رکھا ہو۔ یہاں پر موجود بہت سے افراد کو اس بات کا علم ہوگا کہ میں ایک مسیحی کے طور اپنے عقیدہ پر پختہ یقین رکھتا ہوں، لیکن یہ بات مجھے دوسرے کی بات سننے، سیکھنے اور آگے بڑھنے سے نہیں روکتی۔ اس وقت یہ بہت ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے عقائد سے تبادلہ خیال کر کے مستفید ہوں۔ دونوں مذاہب میں کسی کے پیروکاروں کو اپنے عقائد پر اندھے، غیر ذمہ دارانہ اور دھوکہ آمیز اعتقاد رکھنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

لیکن کیا باہمی برابری پر مشتمل تعلقات کے قیام کے لیے دونوں مذاہب واقعی تیار ہو گئے ہیں؟ کیا ہم دوسرے عقائد کو بھی اتنی ہی مراعات اور حقوق دینے کے لیے تیار ہیں جو ہم اپنے عقیدہ کو دیتے ہیں؟ یہ مسئلہ دنیا بھر میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ مغرب میں مسلمان اقلیتیں اپنے عقیدہ پر آزادانہ عمل، مساجد کی تعمیر اور اپنے بچوں کو اسلام کے اصولوں پر عمل کے لیے بطور شہری اپنے حقوق کے لیے بالکل صحیح آواز بلند کر رہے ہیں۔ اسی طرح عیسائی اقلیتیں بھی دنیا کے بہت سے ممالک میں اپنے حقوق کے لیے جائز مطالبات کر رہی ہیں۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ مصر میں بھی اسلام اور قدیم کوپٹک چرچ (Coptic Church) کے درمیان کئی صدیوں تک باہمی تعلقات بھی بڑے اہم اور متاثر کن رہے ہیں۔ اسی قسم کے برابری پر مشتمل باہمی تعلقات دنیا کے دوسرے ممالک کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، اگرچہ یہ افسوس ناک بات ہے کہ ان تعلقات کو چند نامعلوم وجوہات کی بناء پر ایسے افراد کی طرف سے نقصان پہنچنے کا خدشہ رہے گا جن کی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے درمیان امتیازیت موجود رہے۔

۴۔ تعاون نہ کہ محاذ آرائی

میں نے پہلے بھی اس بات پر زور دیا ہے کہ انسانیت کی فلاح اور ترقی کے لیے مذہبی رہنماؤں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ہم محاذ آرائی اور جارحیت کے متحمل نہیں ہو سکتے، اس لیے خیر سگالی اور مفاہمت پر مبنی امن اور تعاون کی نئی راہوں پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اب تک میں نے عیسائیت اور اسلام کے درمیان پائے جانے والے تضادات پر زور دیا ہے۔ یہ تضادات حقیقت پر مبنی ہیں اور ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن کیا اس سے اس بات کا تاثر ملتا ہے کہ ان کے درمیان اتنی زیادہ مشترک اقدار اور روایات موجود ہیں جن کی موجودگی میں اس سے کہیں زیادہ باہمی مفاہمت اور مشترکہ عمل پروان چڑھ سکتا ہے جتنا ہم سوچ سکتے ہیں یا جتنا ہمارے آباء و اجداد نے ہمیں بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں ایسے باہمی تعلقات کو فروغ دینے کی ضرورت ہے جس پر ہم فخر کر سکیں۔ تضادات کے باوجود بہت سے معاملات اور امور ایسے ہیں جن پر اتفاق رائے کی بنیاد قائم ہو سکتی ہے اور جس سے بیماری، برائی اور غربت پر قابو پانے کے لیے مشترکہ جدوجہد کا عزم کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یہاں پر ان پہلوؤں کی نشاندہی کرنے دیجیے جو اسلام اور عیسائیت میں مشترکہ اقدار اور خیالات کے حامل ہیں۔

مثال کے طور پر دونوں مذاہب کے پیروکاروں کو اچھا شہری، اچھا مسیحا بننے کی ترغیب دی گئی ہے اور اس سے ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاتا ہے جس سے دوسروں کے لیے باہمی احترام اور محبت کی فضا فروغ پاتی ہے۔ اس ملک میں میری مسلمانوں کے ساتھ پہلی میٹنگ سے لے کر اب تک ہونے والی کئی ملاقاتوں کے بعد میں یہ جان کر بہت متاثر ہوا کہ اخلاقی اقدار کے ساتھ وابستگی، خاندان کی

اہمیت، تنازعات کو حل کرنے کے لیے عدم تشدد کا راستہ، ناداروں اور غریبوں کے لیے ہمدردی، فرض اور احتساب کا احساس جیسے سنہری اصولوں کی بازگشت اسلام کے ساتھ ساتھ عیسائی مذہب میں بھی یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ دونوں مذاہب کا اس بات پر بھی پختہ یقین ہے کہ انصاف اور یک جہتی کے اصول معاشرے کے افراد کے دل میں موجود ہونے چاہییں اور ہمارے عقائد کا اتفاق ہے کہ وہ قوانین جو معاشرے میں پائے جاتے ہیں، وہ اپنے طور پر معاشرے کے افراد کو یکجا رکھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتے جب تک وہ ان پر دل سے مطمئن نہ ہوں۔ قوانین کو اخلاقی بنیادوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صرف قانون کے نفاذ سے انسانیت کو بہتر نہیں بنایا جا سکتا۔ ہمارے عقائد کی جو اخلاقی روایات جدید معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہیں وہ قانون کی پہنچ سے باہر ہیں اور انہیں ایسے ہی قوانین کی بنیاد پر انصاف فراہم کیا جاتا ہے اور انصاف کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ یہ سب کے لیے یکساں ہو۔ دونوں مذاہب کا اس بات پر یقین ہے کہ کوئی ایسا دائمی قانون ضرور ہے جس کے ذریعے انسان کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

آخری بات جس کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دونوں مذاہب کا اس دائمی سچائی پر یقین ہے کہ ایک دنیا ایسی بھی ہے جس کو موجودہ دنیا پر فوقیت حاصل ہے اور اس بات پر بھی یقین ہے کہ یہ دنیا کسی حادثہ کے ذریعے معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ اس دنیا میں جو ہم دیکھ سکتے ہیں یا محسوس کر سکتے ہیں صرف اس کے ذریعے ہی اس دنیا کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ دونوں عقائد سیکولرازم کے بطور نظام کے خلاف مشترکہ موقف رکھتے ہیں جو آئندہ زندگی کے تصوّر کے بغیر علم اور ثقافت کے ذریعے زندگی کی وضاحت کرتا ہے۔ ہم ان تمام نظریات کو بھی مسترد کرتے ہیں جو قدرت کو نظر انداز کر کے انسانیت اور انسانی ثقافت کی ایک خود مختار نظریاتی نظام کے طور پر وضاحت کرتے ہیں۔ ہم ایسا اس لیے کرتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ قدرت کے تصوّر کے بغیر زندگی بے مقصد ہے۔ انسانیت کو بقاء کے لیے عقیدہ کی ضرورت ہے۔ اُخروی زندگی پر اعتقاد دونوں مذاہب کے درمیان ایک اہم مشترکہ قدر ہے۔

ان مشترکہ مذہبی اور دینی اقدار اور نظریات سے اس بات کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ اسلام اور عیسائیت ان برائیوں کے خلاف مشترکہ جدوجہد اور حکمت عملی اپنا سکتے ہیں جن سے انسانیت کو خطرہ ہے، لیکن اب یہاں اپنی بات چند الفاظ میں سموتے ہوئے ان نکات کو بیان کروں گا جن کے ذریعے دونوں عقائد کے درمیان تعاون کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

(الف) غربت کے خاتمہ اور انسانی مصائب کے خلاف تعاون

تمام معاشرے انسانی مسائل میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان مسئلوں کو کوئی اکیلا شخص حل نہیں کر

سکتا۔ یہ بہت آسان ہے کہ ہم مایوس ہو کر ہاتھ کھڑے کر دیں اور ان مسائل کے سامنے ہتھیار پھینک دیں، لیکن ہمارے مذاہب کی یہ دیرینہ اقدار اور روایات ہیں کہ ہم سماجی تحفظ اور مربوط ذرائع کی مدد سے ان مسائل پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مذہب ہمیں اس بات کا درس دیتا ہے کہ ہم ان مسائل پر قابو پانا سیکھیں، لیکن ہم اس سلسلہ میں کیے جانے والے اقدامات کو باہمی تعاون سے اور بھی موثر بنا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایمرجنسی ریلیف اور رضاکار اداروں میں متعدد عقائد رکھنے والی قومیں مل جل کر انسانیت کی خدمت کر رہی ہیں اور مجھے خوشی ہوئی ہے کہ کرسچین ایڈ اور اسلامک ریلیف ایجنسی بوسنیا میں ایک مشترکہ منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ میرے ملک برطانیہ کی ایک اور مثال کو لیجیے جہاں پر مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ایک نمائندہ کونسل حکومت کے ساتھ مل کر اندرون شہر مسائل کا جائزہ لیتی ہے اور ان کے حل کے لیے ابتدائی اقدامات تجویز کرتی ہے۔ اس طرح کے اقدامات سے بین المذاہب تعاون کی کوششوں کو فروغ مل سکتا ہے اور مستقبل میں ایسی کوششیں اور اقدامات انسانیت کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ماڈلز کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

(ب) عوام کے درمیان امن اور یک جہتی کا فروغ

مجھے اپنی اس بات پر کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب کو عوام میں امن کے قیام کے سلسلہ میں گہری تشویش ہے۔ یہ بہت افسوس کا مقام ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بیک وقت ۱۰۰ سے زائد لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ تنازعات خصوصاً ایسے جھگڑے جن کی بنیاد مذہبی تضاد پر ہو ان کے حل کے لیے مذہبی رہنما موثر کردار ادا کر سکتے ہیں اور انہیں یہ کردار ادا کرنا چاہیے اور ہم باہمی تعاون کے ذریعے دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال قائم کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے انگلیکن آبزرور (Anglican Observer) کے اقوام متحدہ میں کردار کی تعریف کروں گا اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کروں گا کہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نمائندے وہاں مقرر کر کے امن کے فروغ کے لیے ایسے اداروں میں اپنا کردار ادا کریں۔

(ج) برداشت اور مفاہمت

برداشت اور مفاہمت کا امن کے قیام سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن اس کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ دنیا میں جدھر بھی نظر دوڑاتے ہیں دوسرے انسانوں سے نفرت کے نفسیاتی جذبات (Xenophobia) نسلی اور مذہبی ہم آہنگی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں، حتیٰ کہ میرے اپنے ملک برطانیہ جہاں ہماری مہمان نوازی کی اعلیٰ روایات ہیں، میں بھی یہ نفرت کے جذبات ملک کے

بعض دور دراز حصّوں میں سر اٹھاتے ہیں جس سے ملک کی نیک نامی پر حرف آتا ہے۔ اسی طرح بعض ممالک میں مذہبی انتہا پسند جمہوریت کو خاطر میں نہیں لاتے اور اپنے ملک کو عدم استحکام اور معاشرتی بحران میں دھکیل دیتے ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ بھی اپنے اپنے عقیدوں کے ماننے والوں میں اہم مقام رکھتے ہیں، ان کا یہ فرض ہے کہ جب بعض شر پسند عناصر ہمارے عقائد کے اہم پہلوؤں کے درمیان نفرت کی گرہیں ڈالنے کی کوشش کریں تو وہ ان کے خلاف واضح طور پر آواز بلند کریں اور ان کی مذمّت کریں، کیونکہ قتل، قتل ہی ہوتا ہے خواہ اسے کوئی بھی نام دیا جائے یا اس کی کوئی بھی توجیہ بیان کی جائے، اس لیے ان حالات میں ایسی دوستی جس میں حقیقی برداشت بھی شامل ہو کو پروان چڑھانے کی اشد ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں تشدّد کے خلاف کوششوں اور اقدامات کو مزید تیز کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے یہاں اپنے خطاب میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ چند ایسے نکات کی نشاندہی کر دوں جن کے ذریعے دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مزید مکالمہ (ڈائیلاگ) اور تعاون کی کوششوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ آپ میں سے بہت سے لوگوں کو ان میں سے بہت سے نکات کے بارے میں پہلے سے آگہی ہو گی، جبکہ دیگر کے لیے کئی باتیں نئی ہوں گی، مجھے امید ہے ہم سب کے لیے اس سے ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت اور تعاون کے فروغ کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ میں نے یہاں ایک ایسے مسیحی رہنما کے طور پر خطاب کیا جو یسوع مسیح کے عقیدے پر پختہ یقین رکھتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں کئی سالوں سے دوسرے مذاہب کی اقدار سیکھنے کے عمل سے گزر رہا ہوں اور میں ان عقیدوں کی حامل قوموں کی روایات کا قدر دان بھی ہوں۔ میرا اس بات پر یقینِ کامل ہے کہ دنیا کی قوموں میں امن و امان، یک جہتی کے قیام کے لیے مذہب کا کردار بڑا اہم ہے اور یہ کردار اسی صورت میں موثر ہو سکتا ہے جب اہم مذاہب خصوصاً عیسائیت اور اسلام ایک دوسرے سے نئے تعلقات کو استوار کرنے کے لیے رضامندی کا اظہار کریں گے۔ اس کے لیے ہمیں ان قوموں کے ساتھ کھلے دل کا مظاہرہ کرنا ہو گا جن کے ساتھ ماضی میں ہماری ناچاقی تھی، لیکن یہ بھی کافی نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی ضرورت ہو گی کہ ہم بین العقائد ڈائیلاگ اور اقدامات کا آغاز کریں تاکہ وہ بچے جنہوں نے ابھی اس دنیا میں آنکھ کھولنی ہے وہ ایسی دنیا میں زندہ رہیں جو واقعی امن کا گہوارہ ہو، جہاں حقیقی برداشت پائی جاتی ہو اور جہاں ہم دوستی، برابری، مفاہمت اور تعاون کے اصولوں کو اپناتے ہوئے اسلام اور عیسائیت کے مابین نئے تعلقات قائم کر کے آپس میں بھائی چارے سے رہ سکیں۔